ڈاکٹر خالد اقبال یاسر

فیض: ایک انسان دوست شاعر

Faiz Ahmed Faiz is an ardent humanitarian as he gives revolutionary view of social change. He seeks to promote human welfare and advocates maximum freedom for common man to develop its individual talents and faculties. As a responsible and progressive intellectual, he is deeply concerned with common human needs. Faiz is adherent particularly to the communities aspirations of deprived and oppressed classes and communities. He raised his voice against driving down wages and refusing social benefits for the workers and accumulation of wealth by the capitalists at their cost.

This paper is an attempt to highlight the outlook of Faiz as a poet emphasizing on parity in solving human problems. He concentrated on the struggle for subsistence and the conflict between economic classes based on Marxist humanism and religious ideals at the same time.

انسان دوستی اس ذہنی رویے کا نام ہے جو انسان اور اس کی خصوصیات، معاملات، دنیاوی خواہشات اور فلاح کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔[1] یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کوئی شاعر تو ہو انسان دوست نہ ہو۔ البتہ انسان دوستی کی سطحیں اور زاویۂ نظر مختلف ہوسکتے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی مسلک انسان دشمن نہیں ہوسکتا بایں ہمہ فلسفیانہ سطح پر تو انسان پسندی خود مذہب کے درجے تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ فکری تحریک کے اعتبار سے مسلکِ انسانیت یعنی Humanism وہ ''نظام یا فکری عمل کا مسلک'' ہے'' جس میں انسانی اور دنیاوی مفادات حاوی ہوتے ہیں۔''[2] یہی وجہ ہے کہ humanist کو انسان پرست یا پرستارِ انسانیت کہا گیا۔ اسی اصطلاح کا ایک مترادف Humanitarianism بھی ہے جسے علم الاخلاق کی رو سے نظریۂ انسانیت کہنا چاہیے۔ یہ علم و ادب کا ایک ایسا اصول ہے جس کے مطابق'' انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے۔'' اس نظریے کا'' پیرو انسانی فلاح و بہبود کی کوشش کو ذریعۂ نجات سمجھتا ہے۔''[3] بعض مفکروں کے نزدیک انسانیت کے نظریے میں مذہبی تفریق سے بالا تر ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔ان کے خیال میں'' انسان کا اصل فریضہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہے۔''[4] فیض احمد فیض کی انسان دوستی بھی کچھ ایسی ہی ہے جو انھوں نے شعوری طور پر اختیار کی ہے:'' حیات اِنسانی کی اجتماعی جدّ وجہد کا ادراک اور اِس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔''[5] اور فیض کی شاعری کے مطالعے سے واضح ہے کہ انہوں نے واقعی انسانی فلاح کو اپنے فن کا تقاضا سمجھا اور اسے ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر ایک فرض کی طرح نبھایا ؎

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

(طوق و دار کا موسم/ دستِ صبا/نسخہ ہائے وفا، ص ۔۱۲۸)

اگرچہ فیض کی ابتدائی شاعری (نقش فریادی کے صفحہ ۶۰ تک) مجرد قسم کی عاشقی ،عیش وعشرت کی خواہش ،محبوب کے وصل کے لیے بے قراری اور اپنی زندگی کی زر نگاری سے آگے نہیں نکلی تاہم اس میں بھی خدا ترسی، حساسیت اور دردمندی جھلکتی ہے جو بے دست و پا انسان اور انسانیت کی عکاسی کے لیے زندگی کو کسی مفلس کی ایسی قبا سے تشبیہہ دینے کا، جس میں ہر گھڑی درد کے پیوند لگے ہوں، بالآخر سبب بن جاتی ہے۔ ہیئتی اور اسلوبیاتی تجربات کے ذریعے ایک نئی فکر اور انقلاب کی خاطر راستے ہموار کرنے کی کوشش سے پہلے بھی ان کی ع جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز (نسخہ ہائے وفا ،ص۔ ۱۷) تھا اور ع دکھتا ہوا دل لے کر مایوس سا ہو جانا (نسخہ ہائے وفا ،ص ۱۔۱۹) ان کا فطری اور عمومی رویّہ تھا۔ فیض نے وارداتِ قلب کو ابتلائے ذات میں ڈھالا اور پھر اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز ، سماجی شعور ، آرزوؤں ، امنگوں، حسرتوں، امیدوں اور رویوں کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا ؎

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختمِ عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

(مرگِ سوزِ محبت ،نسخہ ہائے وفا ،ص ۔۷۸)

'عہدِ ترکِ محبت' کی یہ شاعری زندگی کو نکھارنے ، سنوارنے اور معاشرے کو خوبصورت دیکھنے کی آرزو میں تبدیل ہوئی تو فیض نے اپنی انسان دوستی کی پہلی نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' تخلیق کی۔ اب انھیں محبت کے دکھوں کے علاوہ زمانے کے آلام کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ حسن کی دلکشی ، شیرینیٔ لب ،خوشبوئے دہن، شادابیٔ دل، تفریحِ نظر اب ان کی زیست کا درماں نہیں رہے تھے۔ کسی خواب کے جھوٹے افسوں سے ان کے دلِ ناداں کی تسکین ممکن نہیں رہی تھی۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق کے مقابل کھڑے تھے اور ان مظلوموں کی آواز بن گئے تھے جو کسی ظالم کے مقابل سے قتل ہو کے ہی آتے ہیں۔ وہ لذتِ دردِ جگر، نعمتِ دید کے شکر گزار تھے اور خونِ جگر کے برفاب بننے ، آنکھوں کی آہن پوشی ،شعر کے خیموں کے راکھ ہونے اور نغموں کی طنابیں ٹوٹنے کا غم انھیں گھیرے ہوئے تھا۔ ایسے میں وہ سلامت ہاتھوں ، خون کی حرارتوں ، دل کی صداقتوں، نطق کی طاقتوں سے طوق و سلاسل کو شورشِ بربطِ نے سکھلانے کا عزم کرتے ہیں اور شام و سحر، شمس و قمر، اختر و کوکب ، لوح و قلم ،طبل و علم اور مال و حشم پر اپنا حق جتانے لگتے ہیں۔ (شورشِ بربط و نے ،نسخہ ہائے وفا،ص ۔۱۲۲ ۔۱۲۳ ۔۱۲۴۔ ۱۲۵) اب ان کا دکھ انفرادی نہیں رہا بلکہ وہ اپنے دکھوں کے درماں میں تمام انسانوں کے دکھوں کا مداوا تلاش کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا نیا جہاں آباد کرنے کی خواہش کرتے ہیں جو ہر طرح کے استحصال اور استبداد سے پاک ہو ، وہ خود اپنے رقیب کو بتاتے ہیں کہ انھوں نے عشق سے غریبوں کی حمایت اور عاجزی سیکھی، یاس و حرماں اور زیر دستوں کے مصائب کو سمجھا اور ان پر رُخِ زرد اور سرد آہوں کے معانی کُھلے۔ ان کے مزاج اور افکار میں اس تبدیلی کی طرف ہمارے دور کے اہم نقادوں نے توجہ دلائی ہے: ''انھوں نے عشق سے انقلاب کی طرف قدم بڑھایا اور خوبانِ جمال سے علیحدگی اختیار کر کے کشمکشِ اضطراب میں مبتلا ہوئے۔''[۶]

ان کی سوچ میں اس تبدیلی کی مظہر ان کی ایک نظم 'سوچ' ہے (نسخہ ہائے وفا ،ص ۶۵ ۔۶۴) ۔ انھیں تمام دنیا غمگین اور سارے جہاں کا غم اپنا غم لگنے لگتا ہے جو کسی محبوب کے اپنا ہونے سے دور نہیں ہوسکتا، اس لیے وہ خود کو اور محبوب کو دنیا کے غم اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں اور اس کے بعد پیار میں کامیابی کی تدبیریں سوچنے کی تلقین کرتے ہیں چاہے اس کڑی جنگ میں ان کا

اپنا خوں بھی بہہ جائے کیونکہ دنیا کے غم مٹانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ خود مٹ جائیں۔ اس نظم اور بعد کی بہت سی نظموں سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ فیض نے انقلاب کو محبت کے وسیلے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اپنی شاعری کی غنائیت اور رمزیت کو بھی برقرار رکھا ہے جیسے پاسترناک نے بھی وجدان سے انحراف نہیں کیا اور اپنے انقلابی افکار اور خیالات کو غنائیت سے لبریز رکھا۔ ان کا نظریۂ سخن اُن کی ایک نظم ''موضوعِ سخن'' میں بیان ہوا ہے۔ یہ نظم اس دور کی ہے جب ان کا جذبۂ عشق اور انقلاب کی دھن باہمی کشمکش کا شکار تھے، تاہم وہ سرخ و سیہ صدیوں کے سایوں تلے، آدم و حوا کی اولاد کی زبوں حالی، موت اور زیست کی صف آرائی، شہروں کی فراواں مخلوق کا مرنے کی حسرت میں جیئے جانا، جب کھیتوں میں اگتی بھوگ، کڑی دیواروں، خوابوں کی قتل گاہوں کے ادراک اور احساس کے ساتھ ساتھ کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں، اس کے جسم کے دل آویز خطوط، رنگِ رخسار پر ہلکے سے غازے کے غبار، صندلی ہاتھ پر حنا کی تحریر، اس کے ہاتھ سے مس ہونے کو ترستے ہاتھوں، آنچل، رخسار، پیراہن، چلمنِ رنگیں، زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں ٹمٹماتے ہوئے آویزے کو بھی اپنے افکار، اشعار کی دنیا، جانِ مضمون، شاہدِ معنیٰ اور اپنی طبع کا وطن اور موضوعِ سخن قرار دیتے ہیں۔ (نسخہ ہائے وفا، ص۔۸۹، ۹۰، ۹۱)

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہر انسان خاص طور پر باشعور انسان جو شاعر بھی ہو، رومان پرور بھی ہوتا ہے اور حقیقت پسند بھی۔ وہ امن بھی چاہتا ہے اور تبدیلی بھی۔ اسے اپنی فلاح بھی عزیز ہوتی ہے اور بنی نوعِ انسان کی بھلائی بھی۔ اس میں شر بھی پوشیدہ ہوتا ہے اور وہ خیر سے بھی قوت حاصل کرتا ہے یا کر سکتا ہے جیسا کہ طالسطائی جیسے اشتراکی حقیقت نگار میں بھی رومان پروری کے عناصر موجود ہیں البتہ لینن ایسے رومان کو پسند کرتا تھا جو انسان کے بہتر مستقبل اور انسان کی آزادی کے لیے ہو۔ ہمارے ہاں رومان اور حقیقت پسندی، ترقی پسند نظریات سے ہم آہنگ ہو کر ایسی انسان دوستی میں ڈھلے جس پر مارکسیت کے الحاد اور مادیت پرستی کی بجائے روحانیت اور خدا پرستی غالب آ گئی تھی۔ 'انگارے' کی اشاعت کو اگر اشتراکی ادیبوں کی پہلی نادانی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے تو ترقی پسند تحریک پر ردِّ اخلاقیات کا الزام محض الزام رہ جائے گا۔ بیشتر ترقی پسند خود 'انگارے' کی کہیں دبے لفظوں میں اور کہیں واضح طور پر مذمت کرتے رہے ہیں۔ دراصل زندگی کی من حیث المجموع تصویر کشی ترقی پسندوں کا مطمحِ نظر تھی:

> ''زندگی ایک مکمل اکائی ہے۔۔۔ ادب زندگی کا آئینہ اور کاروان حیات کا رہبر ہے۔۔۔ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں۔۔۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔۔۔ اور جملہ بنی نوع اِنسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔''[۷]

سماج میں تبدیلی یا انقلاب کا مارکسی تصور 'انسانی مساوات' کے اصول پر استوار ہے۔ ایسی مساوات جو آجر اور اجیر کی اقتصادی کشمکش کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جب انسان کے محکم ارادے سے تغیر و تبدل رونما ہوتا ہے تو معاشرے کی خارجی طبقاتی ساخت تبدیل ہوتی ہے اور ایسے ہمہ گیر انقلاب سے ایسا ادب تخلیق ہونے لگتا ہے جو معاشرے کے ارتقاء میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس انقلاب سے پہلے جن کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے فیض کی شاعری دراصل معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کے لیے جدّ و جہد اور اس کے انھی مختلف مراحل کو اجاگر کرتی ہے۔ جہاں ہر طرف قتل گاہیں سجی ہیں۔ قتل، قاتل، مقتول، زنداں، دار و رسن، زنجیریں، صلیبیں، قید و بند، لہو، طوق و سلاسل اور ان کے مترادفات و متعلقات ان کی شعری لفظیات کا حصّہ بن جاتے ہیں جن کے

حوالے سے فیض مارکسی انسان دوستی اور ان انسانیت نواز روایات اور تلمیحات کے امتزاج سے ایک منفرد اسلوب تراشتے ہیں جو ہزاروں سالہ عربی عجمی تہذیبی ورثے کے طور پر ہمارے اجتماعی حافظے کا حصّہ ہیں اور ہماری شریانوں میں لہو کی طرح دوڑتی ہیں۔

دراصل اشتراکیت اس دور کا ایک مقبول نظریہ تھا اور انقلابِ روس کی کامیابی سے استعماری طاقتوں کے جبر و استبداد سے تنگ ہو کر جنگ آزما ہونے والی قوموں نے اس سے اثر قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اردو کے شعراء اور ادباء بھی اس بینڈ ویگن میں سوار ہونے کے لیے اپنے معروضی حالات کا درست ادراک کئے بغیر بے تاب ہو رہے تھے۔ ایسے میں فیض سمیت کسی کو ع کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ ، جو جامد مادیت کی کوکھ سے پھوٹا تھا ۔ چنانچہ جیسے دوستوفسکی اشتراکیت کے پرچارک کے طور پر معروف ہوا لیکن اس کا خاتمہ صرف ردِّ انقلاب پر ہی نہیں عیسائیت کی تبلیغ پر ہوا تھا اسی طرح روس کی گرمیٔ رفتار کو بے سود نہ کہنے والے اقبال نے روس کی دہریت کو کلیساؤں کے لات و منات توڑنے کی وحی قرار دیا تھا۔ اسی اقبال نے جب بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی کا ذکر کیا اور ان پر ملحدانہ اشتراکی ہونے کا الزام لگا تو انھیں فوراً اس کی واضح الفاظ میں تردید کرنا پڑی۔ ملحدانہ اشتراکیت پر ان کے خیالات بہت واضح ہیں۔ فیض پر مارکس کے افکار کا اثر صرف یہاں تک ہے کہ مارکس کے آدرش کو فیض نے بھی انسانی زندگی کا مقصد و مطلب سمجھا ۔ شخصی آزادی ، منافع کی منصفانہ تقسیم اور نچلے طبقوں کی بہبود کے علاوہ جنگ سے نفرت اور امن و آشتی کی خواہشات کو فیض نے اپنے دل میں بسا لیا بلکہ لینن کے تتبع میں انقلاب کے تخیل کو انسانی فطرت کے مطابق سمجھ کر دوسروں کو اس کا قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں فیض کی انسان دوستی اس کی ذہنی کیفیت ٹھہری جو فکر و عمل کے ایسے نظام کی خواہش کا موجب ہوئی جو ایک طرف دینی اقدار کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اور دوسری طرف فطرت کے خارجی مظاہر کے ادراک کے ساتھ انسانی معمولات اور جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنی ۔

ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کے حوالے فیض کے ہاں کم ملتے ہیں تاہم خاندان ، مذہب ،جنس ، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی کے خیالات کی روک تھام میں فیض کا حصہ بذریعہ شاعری نمایاں ہے۔ انھوں نے ایسے ادبی رجحانات کا بھی سدِّ باب کیا جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں'۔ فیض نے بھوک ، پیاس ، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل کو نئے ادب اور زندگی کے مسائل کے طور پر پیش کیا۔ یہی مسائل فیض کے خیال میں انسان کو بے بسی سے دوچار کرتے ہیں اور توہم پرستی پیدا کرتے ہیں۔ ایسے مسائل پر تنقید اور ان کے خلاف جدوجہد کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے کشمکش کی جو کیفیت جنم لیتی ہے وہی تغیر اور ترقی کے دروازے کھولتی ہے۔

ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن انعام وصول کرتے ہوئے فیض احمد فیض نے اپنی اردو تقریر میں انھی متضاد عوامل اور قوتوں کا ذکر کیا ہے۔ ''تخریب و تعمیر ، ترقی اور زوال ، روشنی اور تیرگی ، انصاف دوستی اور اِنصاف دشمنی کی قوتیں'' ہی وہ عوامل ہیں جن کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ ان کے نزدیک'' جنگ اور امن کے معنی ہیں امنِ آدم کی بقا اور فنا۔ بقا اور فنا ، ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دار و مدار ہے۔''[۸] یہاں وہ صریحاً مارکسی انسانیت کو مارکس کے تاریخی مادیت اور جدلیاتی آویزش کے نظریے کے حوالے سے دیکھ رہے ہیں، وہ 'حسن برائے حسن' اور 'ادب برائے ادب کی سطح سے بلند ہو کر'' غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ، سمجھتے تھے اور اس ادراک کے بعد کہ 'اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا ، ناممکن ہے، فیض کے تیرہ چودہ

برس' کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں' میں گزرے ۔ اسی لیے ان کی نظر ان گنت صدیوں کے بہیمانہ طلسموں ، ریشم و اطلس و کم خواب میں بنوائے ہوئے جابجا بکتے ہوئے خاک اور خون میں لتھڑے جسموں، امراض کے تنوروں میں بھسم ہوتے لوگوں اور جلتے ہوئے ناسوروں کی پیپ کی طرف لوٹ گئی چنانچہ انھوں نے '' کتے '' جیسی فکر انگیز اور روح فرسا نظم کہہ ڈالی کیونکہ ان کا دل بازار میں مزدور کے بکتے ہوئے گوشت اور شاہراہوں پر غریبوں کے بہتے ہوئے لہو کو دیکھ نہیں سکتا تھا ۔فیض کے لیے یہ ایک نیا راستہ تھا جس پر وہ پہلے نہ چلا تھا۔

میرا مسلک بھی نیا راہِ طریقت بھی نئی
میرے قانوں بھی نئے، میری شریعت بھی نئی

اب فیض بزمِ اصحابِ غم میں شامل تھا اور اسے عجزِ اہلِ ستم اور عظمتِ چشمِ نم کا احساس ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے فیض کے شعری ''اظہار کے تمام پیرائے ، ترکیبیں، تشبیہیں، استعارے، کنایے، شعری لطف و اثر اور کشش و کیفیت پیدا کرنے کے طور طریقے بورژوا شعریات کا حصہ ہیں'' [9] اور یہ مشرقی جمالیات اور عربی عجمی ثقافتی روایات کے امتزاج سے پھوٹنے والا اسلوب اپنی اصل میں مارکسی نظریے سے متصادم و متضاد ہے۔ مارکسی نظریے کو انھوں نے اپنی مرضی سے سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ چونکہ یہ مشرقی شعری نظام فیض کے لاشعور کا حصّہ تھا اور ان کے مزاج میں رچا بسا تھا اس لیے فیض نے پرولتاری انداز فکر اور جدلیاتی کشمکش کو بھی انھی استعاروں اور تلازموں سے اجاگر کیا۔ یعنی ''بورژوا، جمالیاتی پیرایوں اور طریقوں کے دبنے اور دب دب کر ابھرنے کا عمل، فیض کے ہاں اپنی ایک الگ کیفیت پیدا کرتا ہے اور'اسی سے لطف اور اثر، دلآویزی اور دلآسائی ، بالیدگی اور رچاؤ اور ترفع کی شیرازہ بندی ہوتی ہے جس کے لیے فیض مشہور ہے۔'' [10]

بجھا جو روزنِ زنداں تو دِل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھرگئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

لیکن ویرانیِ دوراں کو رقم کرتے کرتے فیض کا لہجہ ہنگامی اور براہِ راست بھی ہوجاتا ہے۔سرِ وادیٔ سینا کی انتسابی نظم اس کی سامنے کی مثال ہے۔ وہ کارخانوں کے مزدوروں ، کھیتوں میں کام کرتے کسانوں ، دماغی مزدوری کرتے کلرکوں ، دکانداروں ، استادوں، طالب علموں اور عام لوگوں کو بھی سیدھا سیدھا کہنے لگتے ہیں کہ دیکھو تمھارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ ان ظلم کے ماروں کو لب کھولنے کی تلقین کر رہے ہیں، احتجاج کے لیے اکسا رہے ہیں کہ ع بول ، زبان اب تک تیری ہے :

بول کہ ہم زندہ ہیں اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

ماؤزے تنگ نے کہا تھا کہ'' جدلی مادیت پر یقین رکھنے والے ادیبوں کے نزدیک داخلی کیفیات اور ان کے خارجی محرکات

ادب کی دو ناگزیر بنیادیں ہیں اور ہر ادب پارہ خارجی اور داخلی دونوں عناصر کا مرکب ہوتا ہے۔''[11]

چشمِ نم ، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں

اسی لیے بازار میں پابجولاں چلنا ضروری ہوتا ہے اور حوصلہ مندی کا اظہار بھی جو نعرہ بازی میں بھی بدل جاتا ہے اور مزدوروں ، ڈاکخانے کے ملازمین اور سول آزادی کی علمبردار انجمنوں کی رکنیت میں بھی متشکل ہوسکتا ہے جو مزدوروں کی عالمی انجمن میں مزدوروں کی باقاعدہ نمائندگی پر بھی منتج ہو ۔ پھر بھی فیض کو یہ قدرت ضرور حاصل تھی کہ اکثر و بیشتر وقتی اور ہنگامی موضوعات پر بھی پر تاثیر اور جذبے سے بھرپور نظمیں کہتے تھے۔ دراصل بے بسوں سے ہمدردی ان کی طبیعت میں رچی بسی تھی ۔ وہ دل گرفتگی اور سوز و گداز سے اکثر دوچار رہتے تھے ۔

شبنم شکیل نے ان کی گوتمی مسکراہٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ'' فیض صاحب کو دوسروں کی خوشی بہت عزیز تھی'' وہ کچھ ایسے ہی تھے''دوسروں کی خوشی کے لیے قربانی دینے والے ۔ دوسروں کو اجلا دیکھنے کے لیے اپنے لباس پر سیاہی برداشت کرنے والے، دوسروں کی آزادی کے لیے اپنے آپ کو گروی رکھوانے اور پھر بھی چپ رہنے والے۔''[12] اسی لیے فیض کو مارکسی انسانیت کی پیروی کرنے میں دیر نہیں لگی ۔لیکن مارکسی انسانیت کے حوالے سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فیض نے اس نظریے کے صرف وہ اجزاء قبول کیے جو ان کے عقائد اور ہماری ثقافتی اور تہذیبی روایات سے متصادم نہ تھے ۔ بالکل اقبال کی طرح اگرچہ انھوں نے اس کا کوئی باقاعدہ اعلان بھی نہیں کیا اور الحاد کا الزام بھی سہہ گئے ۔فیض انسانیت نواز تھے، انسان دوست تھے ، وہ انسانیت کو مذہب نہیں سمجھتے تھے اور ان کی انسان دوستی اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ کسی مافوق الادراک ہستی یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کو خارج کر کے محض انسانی فلاح و بہبود کو ہی ذریعۂ نجات سمجھنے لگیں۔ اگرچہ وہ ایک بار کہہ اٹھے تھے کہ ؎

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا روزِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

لیکن اسی نظم کے مقابل،' وَ یبقیٰ وَجہُ ربّکَ' ، رکھ دیں تو فیض کے اہل یقین اور اہل ایمان ہونے پر کوئی گمان بھی نہیں رہتا۔ اس نظم کا لحن تو سراسر الہامی اور قرآنی ہے اور یہ سورہ القارعہ کا آزاد ترجمہ لگتی ہے اور اس حوالے سے نظم میں خلقِ خدا کے راج کی دعا کی گئی ہے ۔فیض کے ایم اے عربی ہونے سے ہم سب واقف ہیں۔ صرف یہی نظم ہی نہیں فیض کی ساری شاعری عربی، فارسی تلازموں ، دینی اصطلاحوں او رترکیبوں سے مرتب ہوئی ہے۔ نائبانِ خداوندِ ارض ، اہلِ حرم ، آبِ وضو ، درصدق و وفا ، بابِ دعا ، دستِ غیب، ندائے غیب ، خیالِ روزِ جزا ،تسلیم و رضا ، روزِ حساب ، روزِ محشر، جذبۂ شوقِ شہادت ، سنتِ منصور و قیس بھی ان کی لفظیات کا لازمی حصّہ ہیں۔ اسی لیے تو اشفاق احمد نے انھیں ملامتی صوفی کہا ہے ۔

''انھوں نے صوفیا کا تیسرا راستہ اختیار کیا ہے جو مجاہدے پر محیط ہے ۔۔۔ یہ ادب ، یہ صبر، ایسا دھیما پن ، اس قدر درگزر، کم سخنی اور احتجاج سے گریز ۔۔۔'' [۱۳]

حیرت ہے کہ فیض کو جاننے والے انھیں 'ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی' کی حیثیت سے جانتے ہیں۔' ' وہ برہم ہوتے ہیں نہ مایوس ۔سب کچھ تحمل اور خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں'' [۱۴]لیکن ان کا طیش ، شدّتِ جذبات ، ہیجان ، احتجاج اور طوفانوں کی رستا خیز ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ وہاں وہ ایک بالکل مختلف انسان دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دنیا بھر کے مظلوموں کے ترانے لکھتے ہیں اور سطوتِ اسباب اور گراں باریٔ آداب کے ماحول میں' کہرام یارب !' اور ربّا سچیا ! لاؤ تو قتل نامہ مرا ، اور اٹھ ا تانّ نوں جٹّا جیسی پرعزم اور بلند آہنگ شاعری کرتے ہیں ۔ چاہے ع زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے (اے دِلِ بے تاب ٹھہر ! نسخہ ہائے وفا ،ص ۱۰۸) ۔ زباں پر مہر لگ جائے تو وہ ہر حلقۂ زنجیر میں زباں رکھتے ہیں اور خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر ان سے قلم کا کام لینے لگتے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ تشکیک کو جرم نہیں اخلاق کا ایک پہلو سمجھنے والے اہلِ صدق و وفا میں سے ایک فیض احمد فیض ایسے شاعروں میں سے ہیں جو انسانیت نواز ہیں، انسان پرست نہیں خدا پرست ہیں۔ فردِ عمل ، جزا سزا اور کڑے وقت میں خدا کو پکارنے اور اچھے وقت میں خدا کو یاد رکھنے والے فیض ایسے انسان دوست تخلیق کار ہیں جو معقولیت کو الہامی اور تخلیقی سرگرمی کے ایک محرّک کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ چاہے انسان دوستی کو لا مذہب سمجھا جائے یا مذہبی۔ فیض نے اس نظریے کو اپنی طبیعت اور مزاج سے ہم آہنگ پایا ہے اور اسے اخلاقی، سماجی ، سیاسی اور روحانی قدر کے طور پر قبول کیا ہے ۔

آدمیت احترامِ آدمی

باخبر شو از مقامِ آدمی (اقبال)

فیض کی انسان سے محبت کو احمد ندیم قاسمی نے یوں اپنے الفاظ میں سمویا ہے :

''فیض کو سامراج سے نفرت ہے، سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نفرت ہے، غلامی اور انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے سفاکانہ استحصال سے نفرت ہے۔ اتنی بہت سے نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شعروں، چیخوں ، فریادوں سے کان پڑتی آواز سنائی نہیں دیتی مگر فیض کے ہاں ایسی کوئی کیفیت ہے ہی نہیں۔ دراصل ان سب نفرتوں پر فیض کی بنی نوعِ انسان سے محبت آسمان کی طرح چھا گئی ہے۔ یہ ساری نفرتیں فیض کی ہمہ گیر انسان دوستی کی لپیٹ میں آ گئی ہیں''۔ [۱۵]

حوالہ جات وحواشی

۱۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ، جلد ۔ ۱۱، ولیم بینٹن ،لندن ، ۱۹۶۷ء، ص ۸۲۵۔

۲۔ قومی انگریزی ۔اردو لغت: مرتبہ؛ ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۲ ء، ص ۹۴۲ ۔

۳۔ جامع انگلش۔ اردو ڈکشنری جلد سوم ، بیورو فار پروموشن آف اردو ، وزارتِ ترقیٔ انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۵، ص ۱۶۸۔

۴۔ قومی انگریزی ۔اردو لغت مذکور: ص ۹۴۲۔

۵۔ فیض احمد فیض: دیباچہ دستِ صبا ،مشمولہ نسخہ ہائے وفا ، مکتبۂ کارواں ، لاہور، س۔ن ، ص ۱۰۴

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۵۳۰۔

۷۔ اختر حسین رائے پوری: اعلان نامہ، ساہتیہ پریشد، اپریل، ۱۹۳۶ء مشمولہ ادب اور انقلاب، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۸، ص، ۸-۷

۸۔ فیض احمد فیض: تقریر مشمولہ نسخہ ہائے وفا مذکور، ص ۳۰۰۔

۹۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ''فیض کو کیسے نہ پڑھیں؟'' مشمولہ ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، شمارہ مارچ ۲۰۱۱ء ص، ۲۸-۳۹۔
(یہی مضمون ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مرتّبہ کتاب 'فیض فہمی' میں بھی شامل ہے، ص ۶۵-۷۲)

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۱۱۔ ظہیر کاشمیری: ادب کے مادی نظریے، کلاسیک، لاہور ۱۹۷۵، ص ۱۴۷، اس نظم سے مجید امجد کی کتاب 'شبِ رفتہ کے بعد' کے انتساب کا تقابلی مطالعہ بھی نقادوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے۔

۱۲۔ شبنم شکیل: 'یہ جان تو آنی جانی ہے'، مشمولہ فیض فہمی مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۶۵۔

۱۳۔ اشفاق احمد: 'ملامتی صوفی' مشمولہ نسخہ ہائے وفا مذکور، ص ۴۹۵-۴۹۶۔

۱۴۔ شیر محمد حمید: فیض سے میری رفاقت، مشمولہ نسخہ ہائے وفا مذکور، ص ۵۰۱۔

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی: 'فیض۔۔۔نظریات کا شاعر' مشمولہ فیض فہمی مذکور، ص ۱۷۳۔